Article

Contemporary Sensibility in Syed Asad Gilani's Fiction

سید اسعد گیلانی کے افسانوں میں عصری حسیت

Sidra Niamat
Lecturer, Aspire College, Pattoki
Muhammad Farooq Baig
Lecturer, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad Campus
Correspondence: mahadch476@gmail.com

سدرہ نیامت
لیکچرار، اسپائر کالج، پتوکی
محمد فاروق بیگ
لیکچرار، شعبہ اردو، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد

eISSN: **3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received:14-05-2024
Accepted:20-06-2024
Online:28-06-2024

Copyright: © 2023 by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Syed Asad Gilani is a notable Urdu short story writer, celebrated for his portrayal of contemporary sensibility. His stories vividly depict societal issues, human emotions, and social inequalities with a strong sense of realism. Gilani addresses daily struggles, poverty, and class disparities, offering both a portrayal of these challenges and potential solutions.

His characters are complex and well-developed, and his simple yet profound language makes his stories accessible and thought-provoking. Gilani's work serves as a mirror to society, encouraging reflection and action on social issues. His contributions are significant not only in literature but also in raising social awareness, making his narratives impactful and enduring.

KEYWORDS: Contemporary Sensibility, Societal Issues, Realism, Social Inequalities, Psychological Complexities

سید اسعد گیلانی کی افسانہ نگاری چار افسانوی مجموعوں پر مشتمل ہے۔ جن میں پہلا افسانوی مجموعہ ”تصویریں“ ۱۹۵۶ء میں، دوسرا مجموعہ ”تھکی ہوئی روحیں“ ۱۹۶۰ء میں، تیسرا مجموعہ ”حکایاتِ جنوں“ ۱۹۶۲ء میں اور وچوتھا مجموعہ ”لہروں کے نیچے“ ۱۹۶۷ء میں

شائع ہوئے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "عدالت کا انتظار" ۱۹۷۵ء اور "ٹوٹی ہوئی اینٹیں" ۱۹۸۸ء میں انتخاب کے طور پر شائع ہوئے۔

ان افسانوں میں افسانوی مجموعہ "تصویریں" کا افسانہ "کمیں" دیہات کے پس منظر کا عکاس ہے۔ افسانوی مجموعہ "حکایاتِ جنوں" کا افسانہ "مجسمہ اور پرندہ" مملکت خداداد میں خدائی احکامات سے انحراف کی کہانی کا بیان ہے۔ افسانوی مجموعہ "لہروں کے نیچے کا افسانہ"، "لہروں کے نیچے" اشترا کی سرخ جنت کے جہنم زاروں کی کہانی ہے۔ "تھکی ہوئی روحیں" کا افسانہ "مینا چھی کا مندر" تاریک جابرانہ نظام کا ایسا خاکہ کھینچتا ہے جو اس نظام کے نقشوں کو واضح کر دیتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ یہاں انسان نہیں بلکہ پتھر اشرف المخلوقات ہے۔ افسانہ "تھکی ہوئی روحیں" اندیشہ ہائے دور و دراز سے بھرپور ہے جس کا ہیرو کئی طرح کے کربناک مراحل گزر کر شکستہ آرزوں کے ڈھیر میں انسانیت کی تلاش کرتا نظر آتا ہے اور "عدالت کا انتظار" ہجرت کی دکھ بھری کہانی ہے۔ اور افسانہ "کارزارِ حیات" دیہات کے سارے اونچ نیچ دکھاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ناول کا ہیرو نادر دیہات کے ہر رگ اور ہر ادا پر کڑھتا اور اپنے دامن کو ہر طرح کی آلودگی سے صاف صاف بچا کر نکل جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور افسانے بھی اب تک اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

سید اسعد گیلانی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے کچھ افسانے عالمی حالات و واقعات کا اظہار لیے ہوئے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل عمومی افسانہ رومانیت کے ارد گرد گھومتا رہا۔ اس دور کے لکھے گئے سید اسعد گیلانی کے افسانے بھی رومانیت سے بھرپور ہیں۔ جن میں تخیل کی بلندی اور جذبات کی فراوانی نظر آتی ہے۔ ان کے رومانی روایت کے حامل افسانوں میں افسانوی مجموعہ "تھکی ہوئی روحیں" کے افسانے "کورٹ شپ"، "فریبِ نفس" اور "مخالف سمتیں" ہیں۔

سید اسعد گیلانی کے افسانے سماج کا عکس ہیں۔ معاشرے میں ہر طرح کے کردار موجود ہیں۔ ایک طرف لوگوں میں بے حسی کی فضا ہے اور دوسری طرف بے لوث خدمت کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ گو کہ موجودہ مادہ پرستانہ دور میں یہ افراد خال خال ہی ہیں۔ ان کے افسانے معاشرے کے تمام طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں، مزدور اور کسان، جاگیر دار اور سرمایہ داران کے کرداروں میں شامل ہیں۔ حرمت رسول ﷺ ان کے موضوعات میں سے ایک ہے۔ اس کے متعلق انہوں نے اپنے افسانوں میں کردار پیدا کیے ہیں۔ معاشرے میں معاشی طور پر تقسیم در تقسیم نے جو معاشرتی ناہمواری پیدا کی ہے سید اسعد گیلانی اس پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ایک تخلیق کار حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے وہ کسی بھی باریک نکتے کو نہیں چھوڑتا اور اپنی حس

لطیف سے اپنے قلم کے ذریعے اظہار کر دیتا ہے۔ سید اسعد گیلانی بھی ایک حساس ذہن کے مالک ہیں۔ اب ہم ان کے افسانوں میں ان پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔

حکایاتِ جنوں میں 'یہ کتے' افسانہ میں دو افراد اور سید اسعد گیلانی لکھتے ہیں کہ:

> "اس ہمدردی میں انسانی مروت یا اخوت کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی محض روکھے پھیکے بے جان الفاظ تھے۔ جن میں خلوص نیت کی رمق بھی نہ تھی۔ میں نے تو مدد کے لیے آوازیں دی تھیں میرا خیال تھا کہ ان مکانوں میں انسان رہتے ہیں۔ اجنبی نے سرد مہری سے کیا اور بچے کو ساتھ لے کر آگے نکل گیا ہے۔"(۱)

بے حسی دماغ کی ایک ایسی کیفیت ہے جس کی نشاندہی یا پسند کرنا کسی فرد شے یا حالات سے قطع نظر در پیش اس لفظ کی اصل لا طینی لا تعلقی میں پائی جاتی ہے۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے، ایک شخص دوسروں سے یا اُس کے ماحول میں کیا ہوتا ہے اس سے لا تعلق رہ سکتا ہے کیونکہ اس نے ہمدردی کا ایسا جذبہ پیدا نہیں کیا ہے جو اسے دوسروں کی ضروریات کے ساتھ مربوط ہونے دیتا ہے مثال کے طور پر جب کسی قریبی کی صورتحال یا پریشان کے لیے ہمدردی نہیں دکھائی جاتی ہے۔

سید اسعد گیلانی اپنے افسانے 'ڈاکوؤں کی بستی' میں معاشرتی بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک لڑکی جو کہ بے حسی کا شکار ہو کر پھانسی کے پھندے پر جھول جاتی ہے، کا اس انداز میں تذکرہ کرتے ہیں:

> "دیکھو سچ سچ بتا دو ہم سے کوئی شخص اپنا جرم نہیں چھپا کر نہیں لے جا سکتا اور کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا میں تھر تھر کانپ رہی تھی اور میری ٹانگوں میں دم نہ رہا تھا۔ وہ کتے کی طرح آنکھیں جھپکا جھپکا کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ چیخوں لیکن میں چیخ نہ سکی۔"(۲)

معاشرے کو بستی کی علامت سے ظاہر کرتے ہوئے سید اسعد گیلانی معاشرے میں ہونے والی قتل و غارت اور جنسی ہراسانی پر تنقید کرتے ہیں۔ ایک منظر میں وہ دکھاتے ہیں کہ ایک لڑکی کو سرکاری اہلکار کس طرح اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

> "پیچھے ہٹو۔ کمینے ذلیل، کتے'

میں نے چیخ کر کہا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ میں نے زور سے چیخنا چاہا لیکن اچانک اس کا ہاتھ میرے منہ پر آہنی ہتھوڑے کی طرح آ کر لگا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ پھر ایک زور کا طمانچہ میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے پھر میری گردن پر ایک شدید ضرب پڑی اور پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔“(۳)

ایک اور افسانے ’عدالت کے انتظار‘ میں انصاف کی عدم فراہمی اور نظام عدل کی بے حسی کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں ایک لڑکی ساجدہ ہے جس کے اعزاو اقربا کو سرعام قتل کر دیا جاتا ہے اور لوگ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ یہ افسانہ معاشرتی بے حسی کی بدترین مثال ہے۔ افسانہ عدالت کا انتظار میں بے حسی کا ذکر کچھ اس طرح ہوا ہے کہ:

”اس کے میرے بھائی کامل کو ریلوے پھاٹک پر گولی مار دی گئی اور کسی عدالت یا یونین کا دروازہ نہ کھٹکا۔ غنڈوں کے جتھے اس کے گھر میں گھس کر سب کچھ لوٹ لاٹ کر لے گئے لیکن کسی کو مدافعت کی ہمت نہ ہوئی کوئی رپٹ درج نہ ہوئی نا انصافی کرنے کے لیے تھانے بند ہو گئے عدالتیں مقفل ہو گئیں۔ جمہوری حقوق کی حفاظت کے دستور معطل ہو گئے کاش کوئی اس مقدمہ بھی UNO میں لے جاتا کہ بے گناہ ساجدہ جو ملک ہندوستان میں بہار کے صوبے کے ایک معزز مسلمان گھرانے کی خاتون تھی کس طرح بے گناہ، تباہ و برباد کر دی گئی تھی۔ تاکہ قوموں کی اسمبلی اس پر غور کرتی لیکن دنیا اس کے رضاخانے میں جہاں ایٹم بموں اور ہائیڈروجن بموں کے دھماکوں سے چھوٹی چھوٹی قوموں تک آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہاں بے بس ساجدہ کی آواز کون سنتا۔“(۴)

معاشرہ کس ڈگر پر جا رہا ہے، بے حسی، عدم مساوات اور عدل کی عدم فراہمی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ اسی افسانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کھاتا پیتا گھر اجڑ جاتا ہے اور وہی لوگ جو سر جھکا کر سلام کرتے ہیں دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے۔

”کسی کے صحن کے کوئی بلا اجازت داخل ہو جاتا تھا تو مقدمے چل جاتے تھے لیکن یہ کیا ہو گیا اس کے پیارے ماحول کو جو مدت دراز سے کانپور میں باعزت زندگی گزار رہے تھے ان کا اپنے شہر بلکہ اپنے محلہ والوں نے گلی کے نکڑ پر بکرے کی طرح ذبح کر دیا اور کوئی پنچائیت نہ بیٹھی۔“(۵)

سید اسعد گیلانی کے ہاں افسانوں میں ایک رنگ سماجیات کے مطالعے کا نظر آتا ہے جس میں وہ انسانی رویوں کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں ان کے ہاں معاشرتی اور نفسیاتی اظہار کے جو افسانے ملتے ہیں۔ ان میں انسانی رویوں کا اتار چڑھاؤ بخوبی ملتا ہے ۔اس حوالے سے ان کے دو افسانے "روشنی اور سائے" اور "حاجی کا بچہ" نہایت معیاری افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

خدمت خلق کے لغوی معنی مخلوق خدا کی خدمت کرنا ہے۔صرف مالی مدد کرنا ہی خدمت خلق نہیں ہے بلکہ کسی کی عیادت کرنا، کسی کو ہنر سکھانا، کسی کو تعلیم دینا، کسی کو مفید مشورہ دینا، کسی کے دکھ درد میں شریک ہونا، کسی کے لیے دعا کرنا اور چرند پرند کے لیے خوراک کا پانی کا سائے کا انتظام کر دینا بھی خدمت خلق میں شمار ہوتا ہے۔خدمت خلق کے لیے مال خرچ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بے حد پسند کرتا ہے۔ان کے خرچ کو اپنے ذمے قرض حسنہ قرار دیتا ہے اور خرچ کرنے والے کے مال کو کئی گنا بڑھا کر واپس کرتا ہے۔اس سے رب تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ انسان کو ذہنی اور قلبی سکون بھی نصیب ہوتا ہے اور ہمارا دین اسلام بھی خیر خواہی امن و سلامتی اور انسانیت کے احترام کا درس دیتا ہے۔بعض علماء کے نزدیک عبادت کا خلاصہ دو چیزوں میں ایک امر الٰہی کی تعظیم اور دوسرا خلق خدا پر شفقت ہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں حقوق العباد پورا کرنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

> "وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا"(٦)
>
> ترجمہ:"اور اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں، باپ، قرابت داروں، یتیموں، ناداروں، رشتے داروں، ہمسایوں، اجنبی ہمسایوں، پاس بیٹھنے والوں، مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ حسن سلوک کرو بے شک اللہ تکبر کرنے والے، بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔"

سید اسعد گیلانی کے افسانے نیکی کا پرچار کرتے ہیں اور برائی کی نفی کرتے ہیں۔بنیادی طور پر تحریک ادب اسلامی کے مقاصد میں سے ایک مقصد اچھائی کا فروغ بھی ہے۔اسعد گیلانی کے افسانوں میں کئی کردار ایسے موجود ہیں جو خدمت خلق میں مصروف نظر آتے ہیں۔افسانہ 'جنتی' میں کریم نامی کردار خدمت خلق کے حوالے سے نمایاں ہے۔

”اسے خدمت خلق کے کاموں سے ہمیشہ دل چسپی رہی چنانچہ ادارہ تعمیر ملت کے زیر اہتمام مدرسہ سے ملحق خیراتی شفاخانہ میں وہ اپنے فارغ اوقات میں سے باقاعدگی سے وقت دیتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے ایک اچھے کمپاؤنڈز کی طرح کام کرنا شروع کر دیا۔ جس کے لیے ادارہ نے معاوضہ بھی مقرر کر دیا۔ جس میں سے اپنے ذاتی اخراجات نہایت کفایت سے پورے کرنے کے بعد وہ پانچ ساتھ روپے اپنے والد کے نام کاوہ بھیج دیا کرتا۔ اسی دوران میں اس نے ذاتی شوق سے کچھ طبی مطالعہ بھی کر لیا جس کے سبب معالج کی غیر موجودگی وہ خود بھی مریضوں کو ادویات دینے کے قابل ہو گیا۔“(۷)

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ”اے نبی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کس طرح کا مال خرچ کریں کہہ دو کہ جو چاہو خرچ کرو لیکن جو مال خرچ کرنا وہ درجہ بہ درجہ اہل استحقاق یعنی ماں باپ کو قریب کے رشتے داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں سب کو دو اور جو بھلائی تم کرو گے اللہ اسے جانتا ہے۔“(۸)

مجموعہ حکایات جنوں میں افسانہ لال کوٹھی میں اسعد گیلانی ایک ایسے شخص کو پیش کرتے ہیں جو خدمت خلق اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔

”سیٹھ صاحب ایک دین دار آدمی تھے۔ اور مذہب سے بغاوت کرنا ان کے نزدیک بہت بری بات تھی یہی وجہ ہے کہ ہر سال ایک بدل شخص کو حج کے لیے بھی روانہ کرتے تھے۔ ویسے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ کیمونزم بہت مفید چیز ہے اور پرانا اسلام اس زمانے میں کیمونزم کے ہی رنگ میں آیا ہے ۔ اس لیے وہ شہر کی کئی ایک یونینوں کے صدر تھے اور ان کے جلسوں میں مزدوروں کے حقوق کے تحفظ اور پر امن جدوجہد کے موضوع پر کئی تقریریں کر چکے تھے۔“(۹)

انسانوں سے محبت و الفت شفقت و پیار اور ضرورت مند انسانوں کی مدد کرنے کو ہر دین اور مذہب میں تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن دین اسلام نے انسانی خدمت کو اخلاق حسنہ اور عظیم عبادت قرار دیا ہے۔ اللہ رب العزت نے انسانوں کو اپنی ایک الگ الگ صلاحیتوں کا مالک بنایا ہے اور یہی فرق و تفاوت اس کائنات ہستی کا حسن و جمال ہے۔

حضور رحمت عالم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے انسانوں کو باہمی ہمدردی اور خدمت گزاری کا سبق دیا۔طاقتوروں کو کمزوروں پر رحم و قربانی اور امیروں کو غریبوں کی امداد کرنے کی تاکید و تلقین فرمائی۔ مظلوموں اور حاجت مندوں کی فریادرسی کی تاکید فرمائی، یتیموں، مسکینوں اور لاوارثوں کی کفالت اور سرپرستی کا حکم فرمایا ہے:

"خیر الناس من ینفع الناس"(۱۰)

"تم میں سے بہترین وہ ہے جس سے دوسرے انسان کو فائدہ پہنچے"

خدمت خلق وقت کی ضرورت بھی ہے اور بہت بڑی عبادت بھی ہے کسی انسان کے دکھ درد کو بانٹنا حصول جنت کا ذریعہ ہے کسی زخمی دل پر محبت و شفقت کا مرہم رکھنا اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے کسی مقروض کے ساتھ تعاون کرنا اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کو حاصل کرنے کا ایک بڑا سبب ہے۔کسی بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کا حق بھی ہے۔اور سنت رسولؐ بھی ہے کسی بھوکے کو کھانا کھلانا عظیم نیکی اور ایمان کی علامت ہے۔

زمانہ قدیم سے انسان کا یہ وطیرہ رہا کہ وہ انواع واقسام کے تقابلی جائزہ فکر اور اونٹ نئی ایجادات کا عنائی رہا اس کو انسانی جبلت کہا جائے یا وقت کے ساتھ ساتھ آنے والی معاشرتی تبدیلیوں کے نتیجے میں اجاگر ہونے والی سوچ انسان کو ہر دور میں ہی جدت پسندی اور تحقیق سے عملاً وابستہ رہا۔اس اختراعی سفر نے انسانی زندگی کو بہت آسانیاں بھی فراہم کیں اور اس کی ترقی کے نتیجہ میں انسان بے شمار معاشرتی ناہمواریوں کا سامنا بھی کر رہا ہے۔قرہ ارض پر بسنے والے بنی نوح انسان اپنی ترقی کی رفتار کو بڑھانے میں مصروف اس سوچ سے بے خبر ہوتے گئے کہ ترقی کی اس دوڑ میں انسان کی اپنی ایجادات اس کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔پتھروں کو دور سے شروع ہونے والا سفر تیغ، تلوار، نیزہ، بندوق، توپ سے گزر کر آج ایٹمی توانائی سے تیار ہونے والے انسان کس مہلک ہتھیاروں تک آن پہنچا۔

انفرادی زندگی سے ابتدا کرنے والا انسان لاشعوری طور پر خاندان کے ادارے کو تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی ملکیت کی لالچ میں بھی مبتلا ہوتا چلا گیا۔بنیادی ضروریات خوراک، چھت، دفاع اور جنبی اختلاط تک محدود رہنے والا قدیم دور کا انسان آج تراوٹ جدت پسندی کی چاہ اور اپنے آپ کو امتیازی حیثیت دلوانے کی خواہش میں خود کو مختلف زبانی، لسانی، مذہبی علاقائی اور قومی گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے اپنے دائرہ عمل کو متعین کرچکا ہے۔انسان نے ہر شعبہ میں ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اچھے اور برے نتائج کا سامنا بھی کیا۔طبقاتی گروہوں نے اپنی اپنی ترجیحات اور مزاج کے مطابق اپنے اپنے گروہ کی شمولیت اختیار کی۔

ترجیحات اپنے ارتقائی عمل سے گزرتی ہوئی تمدنی اور ثقافتی ڈھانچے میں ڈھلتی گئیں۔ جہاں ہم ترقی اور تعلیم یافتگی کو پروان چڑھانے لگے وہاں ہمیں کبھی اس بات کا شائبہ نہ ہوا کہ ہم اپنے مقاصد کے حصول کے درپے کسی دوسرے کے حقوق کو سلب یا پامال تو نہیں کر رہے ترقی پسند معاشرہ دنیا کی دوڑ میں ہمیشہ آگے رہنے کے خواہاں لوگوں کا وہ گروہ ہے جو ہمیشہ بے حسی کو پریکٹیکل ہونا گردانتا رہا اور معاشرے میں اختلافات پیدا کرتا رہا۔ ترقی کی راہ پر برق رفتاری سے بھاگنے والے انسان نے معاشرے کے اندر کئی اخلاقی شگاف پیدا کر دیے۔ ترقی تو جاری ہے مگر معاشرہ ناہمواری سے متعارف ہو گیا۔ دنیا ترقی کی منزلوں کو طے کرتے گئی اور معاشرے میں خلا پیدا ہوتے چلے گئے۔

گروہ اپنے اپنے مفادات کے تحفظ میں دوسروں کے حقوق سلب کرنے لگے۔ چھینا جھپٹی، نفسا نفسی، خود پرستی اور خود غرضی نے معاشرے کے اندر منفی کیفیات کو جنم دیا۔ سُکھ کی تلاش میں سرگرداں انسان دکھوں کا موجد بھی کہلانے لگا۔ ساری دنیا کی خبروں اور حالت حاضرہ کا محاصرہ کرنے والا انسان اپنے آباؤاجداد کی تہذیب سے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

ہماری بقاء اپنے اسلاف کے اسلوب سے جڑے رہنے میں ہے آپسی محبت اور بھائی چارے کی مدد سے برداشت اور رواداری کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے وہ لوگ جن سے ہمارے نظریاتی، طبقاتی، لسانی، یا سیاسی کسی بھی قسم کے اختلافات ہیں۔ ہمیں ان کے عقائد پر بلا وجہ تنقید اور نکتہ چینی سے صریحاً اجتناب کرنا چاہیے تاکہ عالمی معاشرے میں امن کی فضاء قائم و دائم رہے۔

معاشرتی ناہمواری سے مراد یہ ہے معاشرے کے وسائل تک سب کی رسائی نہ ہو۔ جو دولت مند ہے وہ تو سب کچھ سمیٹ لے اور جو غریب ہے وہ منہ دیکھتا رہ جائے۔ اس کے نتیجے میں جو معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان میں غربت، چوری، ڈکیتی، خودکشی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو خاندانی ہے جس میں کچھ ایسے رشتے تشکیل پا جاتے ہیں جو انسانی نفسیات کو تباہ کر کے معاشرتی ناہمواری کا سبب بنتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی اسعد گیلانی کے افسانہ 'ڈاکوؤں کی بستی' میں بیان کی گئی ہے۔

افسانہ ڈاکوں کی بستی میں ایک بہت سی دلچسپ کہانی بیان کی گئی ہے۔ ایک لڑکی جس کا کردار زیر غور ہے۔ وہ اس معاشرے کے ظلم و ستم ظلم و زیادتی کی وجہ سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ لڑکی جس کا نام زرینہ ہوتا ہے وہ پڑھائی کی غرض سے دوسرے شہر میں جاتی ہے۔ اور اپنی تعلیم حاصل کرنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس معاشرے میں عام فعل جو کہ ہوتا ہے۔ اس غریب لڑکی کو ایک تھانیدار نے ہراسا کیا اور اسے ظلم و زیادتی کا شکار کیا۔ اس لڑکی کے ساتھ بہت زیادتی کی گئی اس کی عزت کو پامال کر دیا گیا۔ اس نامعلوم لڑکی جس نے کرہ ارض کو اپنے نیچے سے پرے لڑھکا دیا تھا اور اس لڑکی نے خودکشی کر لی۔

"میں نے طے کیا کہ میں اپنے آپ کو کسی درخت کے ٹہنے سے دوپٹے کے ساتھ لٹکا کر مار دوں گی۔ اس لئے کہ میری زندگی اب میرے بھائیوں اور میرے باپ کے سینے پر ایک زندگی بھر کا ناسور ہے۔ میں مر جاؤں گی تو وہ رو دھو کر چند دن کے بعد مجھے بھول جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ میری ذلت کو میرا یہ فعل ان کے نزدیک کم کر دے اس لیے کہ وہ فوجی آدمی ہیں لیکن اگر زندہ رہوں گی تو میں ان کے لئے اور ان سب کے لئے جو مجھ سے کسی نہ کسی صورت سے وابستہ ہونگے چلتا پھرتا عذاب ہو گی۔ لوگ میری طرف انگلیاں اٹھائیں گے، سرگوشیاں ہونگی، میں نے یہ سب کش ھ سوچ سمجھ کر طے کیا ہے۔ موت کو دلوں دعوت دینے میں کوئی جذباتی پن نہیں ہے۔ میں نے ٹھنڈے دل سے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں کسی کا ہاتھ نہیں ہے۔ سوائے اس سارے ڈھانچے کے جس پر ہمارا سماج کھڑا ہے یا اس نظام کے جس کے آپ سربراہ کار ہیں۔"(۱۱)

اس افسانے میں وہ کردار ایک خط کے ذریعے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتی ہے کہ اس نے خودکشی جیسی قبیح حرکت کیوں کی اور ایسا کرنے پر وہ کیوں مجبور ہوئی:

"وہ نامعلوم لڑکی لکھتی ہے کہ اب میں اپنی داستان ختم کرتی ہوں اس دن کے لئے جب یہ مقدمہ دوبارہ خدا کے حضور پیش ہو۔ کائنات کے وسیع خلا میں اپنے بازو پھیلائے اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتی رہوں گی۔ الوداع میری امی میرے عزیز ابا اور میرے پیارے بھائی تمہاری گنہگار زری سورج نکلنے سے قبل ہی تاریکی میں منہ چھپا کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے گی تا کہ آپ کے پاکیزہ دامن پر وہ بد نما داغ نہ بن سکے۔ الوداع زرینہ خدا داد۔"(۱۲)

ایک تخلیق کار بہت حساس ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں ہونے والی تکالیف اور زیادتیوں سے سب سے پہلے متاثر ہوتا ہے۔ اسعد گیلانی بھی ایک افسانہ نگار ہونے کے ناتے معاشرے میں ہونے والی زیادتیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں میں ایک الگ قسم کے کردار پیش کیے ہیں جن میں غلطی کے احساس اور تاسف کے رویہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دنیا کی اس زندگی میں انسانوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے آدمی بعض ایسی زیادتیاں بھی کر جاتا ہے جو نہ وہ ارادے سے کرتا ہے اور نہ اس کا شعور اس میں کوئی حصہ لیتا ہے بلکہ معاملہ کرتے ہوئے وہ محسوس کرتا ہے کہ معمولی حالات میں انصاف کا

پہلو یہی ہے اور اس کا ارادہ انصاف بھی کرنے کا ہوتا ہے۔ لیکن کچھ مدت گزر جانے کے بعد جب وہ ان معاملات پر نظر ثانی کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ زیادتی کر گیا۔ وہ ایک زیادتی ہوتی ہے جس میں نہ اس کے ارادے نے شمولیت کی ہوتی ہے نہ اس کے نفس نے لذت پائی ہوتی ہے اور نہ اس کے شعور نے اسے پہچانا ہوتا ہے۔

بعض اوقات انسان اپنی زندگی میں ایسی غلطیاں یا زیادتیاں کر جاتا ہے کہ انسان کے پاس ملال یا افسوس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کی سوچ اس وقت منفی سوچ پر ہی منحصر ہوتی ہے اور اس طرح اس کی اس قسم کی زیادتیوں کا ازالہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اسعد گیلانی کے افسانہ 'تاسف' میں کچھ اس طرح کی ہی کہانی بیان کی گئی ہے:

> "انسان جب لاشعوری طور پر کوئی کام کرتا ہے تو اسے اس وقت معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس کام میں کوئی زیادتی کر رہا ہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو اس کو وہ اپنی غلطی یا زیادتی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن تب وقت گزر چکا ہوتا ہے اس کے پاس تاسف / افسوس کے سوا کچھ نہیں رہتا۔"(۱۳)

'تاسف' میں کچھ کردار بیان کیے گئے ہیں جن میں کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنی گذشتہ غلطیوں کا ملال اور تاسف ہوتا ہے جن کو وہ درست نہیں کر سکتے۔ ان میں سے پہلی کہانی زید اور طاہرہ کی ہے:

> "زید اور اس کی بڑی بہن دونوں کھیل رہے تھے۔ اچانک طاہرہ نے زید کو انگوٹھا دکھایا۔ زید چڑ گیا اور جھٹ کر طاہرہ سے چمٹ گیا اور اس کے کان میں پڑا ہوا۔ آویزہ گھسیٹ کر لے گیا طاہرہ کا کان پھٹ گیا خون طاری ہو گیا اتنی طاہرہ کو ڈانٹ پڑی کہ اس نے کیوں چڑایا۔ زید اب بڑا ہو گیا ہے سوچتا ہے کہ اس نے کتنی زیادتی کی تھی لیکن طاہرہ کی شادی ہو چکی ہے وہ کئی بچوں کی ماں ہے اس سے سینکڑوں میل دور رہتی ہے اب وہ ایک دوسرے کو ملنے کے لئے ترس جاتے ہیں۔ تلافی کیوں کر ہو زید صرف مناسب ہے۔"(۱۴)

افسانہ 'تاسف' میں ایک اور کہانی کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ دو بھائی جو کہ بچپن میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں اور اسی بات کی وجہ سے دونوں میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ دوسری کہانی جمال اور کمال کی ہے:

> "جمال کو عادت تھی کہ اپنے بھائی کمال کو اپنے ساتھ کھیلنے نہ دے ایک روز جمال اپنے دوستوں کے ساتھ تالاب میں نہانے گیا۔ کمال نے بھی جانے کی ضد کی جمال کے ہزار روکنے پر بھی جب کمال نہ رکا اور ان کے پیچھے چلتا ہی رہا تو اس نے ایک ڈھیلا اٹھایا اور کمال کو

زور سے دے مارا جو اس کے سر میں لگا اور کمال ہائے کہہ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اب جمال سوچتا ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی کمال ملٹری میں ملازم ہو کر اس سے کوسوں دور کیمپ کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اب ان کی ملاقات بھی مدت کے بعد ترس ترس کر ہوتی ہے تو اس کی نظر میں وہ منظر آ جاتا ہے۔ اب اس کے پاس اس زیادتی کی تلافی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ جمال صرف متاسف ہے۔"(۱۵)

بالکل اسی طرح ایک اور کہانی یوں بیان ہوتی ہے کہ غلطی سے ایک بہن جس کا نام ساجدہ ہے۔ ساجدہ نے کھیلتے ہوئے انور کی شرارتوں سے تنگ آ کر چولھے میں سے ایک چھوٹی سی جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر انور کی طرف گھمائی جو سیدھی انور کی آنکھ میں گھس گئی۔ آنکھ کا اوپر کا حصہ جلس گیا۔ بڑی مشکل سے بینائی بچ سکی۔ اب وہ جب دونوں بڑے ہو کر اپنے اپنے علیحدہ گھروں میں ہیں تو وہ اکثر پچھتاتی ہے لیکن تلافی کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔ بس ان کے پاس افسوس اور تاسف کے سوا کچھ نہیں۔

افسانہ "ڈاکوؤں کی بستی" ایک ایسے گھرانے کی ذہنی سوچ کا اظہار ہے جو ترقی اور تعلیم کے شوق میں اپنی بچی کو ایک مخلوط تعلیم گاہ میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کرتا ہے جو وہاں اپنے داخلے کو ایک چڑیا گھر میں نئے جانور کا داخلہ تصور کرتی ہے۔ اوراس کی کیفیت ایسی تھی جیسے بھوکے کتوں کے آگے چند ہڈیاں پڑی تھیں۔ بلیوں کے سامنے چند چھچھڑے رکھے تھے یا چوروں کے سامنے بندھی ہوئی چند گٹھڑیاں پڑی تھیں۔ بے جان خاموش اور مسلسل کچو کے دیتا ہوا سارا ماحول۔

یہی ماڈرن خاندان اپنے کسی بیمار رشتہ دار کی تیمارداری کے لیے جہلم سے پشاور اپنی بیٹی جو کالج میں تھرڈ ائیر طالبہ تھی کو اکیلے روانہ کر دیتا ہے۔ جسے سفر کے دوران پنڈی ٹرین تبدیل کرنا تھی مگر وہاں اسے حادثاتی طور پر چوری کے الزام میں تھانے لے جایا جاتا ہے۔ اس پر جو گزرتی ہے اس کے نتیجے میں وہ خودکشی پر مجبور ہو جاتی ہے۔

وہ اپنی کہانی ایک خط میں بیان کرتی ہے کہ مجھے جہلم سے پشاور جانا تھا اور پشاور کی گاڑی راولپنڈی اسٹیشن سے پکڑنی تھی جس کا وقت ساڑھے آٹھ بجے تھا۔ میں اسی انتظار میں بیٹھی تھی کہ علاقہ کے تھانیدار نے ایک چوری کی سازش میں پکڑوایا اور تھانے لے گیا۔ میں نے اپنی بے گناہی کے جتنے ترلے کئے وہ نہ مانا پھر تھانیدار کے کرتوتوں کو اس نے خط میں یوں بیان کیا۔ افسانہ نگاری نے خط کی صورت زرینہ کی آپ بیتی بیان کی:

"اچانک اس کا ہاتھ میرے منہ پر آہنی ہتھوڑے کی طرح آ کر لگا۔ میری زبان لڑکھڑائی۔ ایک زور کا طمانچہ میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا اور میری آنکھوں نے سامنے تارے

ناچنے لگے ۔ پھر میری گردن پر ایک شدید ضرب پڑی اور معلوم نہیں کیا ہوا؟ میرے
چاروں طرف آگ ناچ رہی تھی۔ آگ کے شرارے میرے جسم پر تڑاخ رہے تھے ۔
میرے جسم کو جیسے کتے بھنبھوڑ رہے تھے، میں جیسے مر گئی تھی اور میری لاش کو جیسے گدھ
نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور میری روح کو آگ کی سلاخوں میں بھونا جارہا تھا۔ جب میری
آنکھ کھلی تو میں ایک بستر پر پڑی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا کہ میں لُٹ گئی تھی۔ میں تباہ ہو گئی
تھی اور میری زندگی سے پاکیزگی کا موتی چھلک کر ٹوٹ گیا تھا۔"(۱۶)

صبح منہ اندھیرے تھانیدار نے یہ کہہ کر زرینہ کو باہر نکال دیا کہ میرا نام عنایت خان ہے اور پنڈی کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے میرے علاقے میں کوئی مشکل آئے تو بس میرا نام عنایت خان لے دینا اتنا ہی کافی ہو گا۔

افسانے پر افسانہ نگار کی گہری گرفت نظر آتی ہے اور ان کے ہاں انسانی نفسیات بھی مطالعے کو ملتی ہے۔ افسانے میں اس طرح کا اظہار افسانہ نگار کا انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کا پتہ دیتا ہے۔ اب انجام زرینہ کا بھی ہے اور کہانی کا بھی:

"میں نے تہیہ کر لیا کہ اب بھائیوں اور ماں باپ کو کیسے منہ دکھاؤں۔ ڈاکوؤں کی اس بستی
میں اب کیسے زندہ رہوں۔ درندوں کے اس بھٹ میں کیسے سانس لوں۔ جہاں میں کسی کی نہ
بہن ہوں، نہ بیٹی اور نہ ماں ۔ صبح ہونے والی تھی۔ میں سورج کی شعاعوں سے پہلے اس کرہ
ارض پر زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اب میں اس دن کے لیے جب یہ مقدمہ دوبارہ خدا کے
حضور پیش ہو گا۔ میں کائنات کے وسیع خلا میں اپنے بازو پھیلائے اس دن کا بے چینی سے
انتظار کرتی رہو نگی۔"(۱۷)

افسانے میں فنی پختگی اور مقصدیت سید اسعد گیلانی کے فنِ افسانہ کو نمایاں کرتی ہے۔ قاری گہری سوچ میں پڑا افسانے کو پڑھتا ہے اور اپنے خیالوں میں فکر مندی کے جذبات کا ایک طوفان اٹھتے دیکھتا ہے۔

وہ نگاہ خاص جس کی جھلک اشرف نے پہلی بار دیکھی وہ اس کے سینے میں اتر گئی تھی اور جا کر دل کو پکڑ لیا تھا اور اس کے دل کی دنیا میں طوفان آ گیا۔ ایک عظیم کشمکش اس کے داخلی عالمِ وجود میں شروع ہو گئی۔ افسانہ کے مرکزی کردار کی یہ اندرونی کشمکش افسانہ نگار یوں بیان کرتا ہے:

"اب کوئی نہ جانتا تھا کہ اشرف کے ساتھ کیا بیت گیا۔ وہ کچھ کھویا کھویا حیران حیران اور گریزاں
گریزاں سا رہنے لگا۔ پھر وہ اس بات پر سوچتا رہتا کہ وہ سعید اور شقی انسانوں کی فہرستوں میں

کس فہرست میں شامل ہو رہا تھا۔ انجامِ خیر، انجامِ بد، بس یہ الفاظ اس کے دل میں گونجتے
رہتے اور وہ نمازوں میں دعائیں کرتا یا الٰہی! راہ راست پر استقامت عطا فرما، مدد فرما اور مجھے
تباہی سے بچالے۔"(۱۸)

اشرف سوچ میں پڑ گیا کہ شیطان انسانوں کو انسانوں کے ذریعے شکار کرتا ہے۔ وہ دل گرفتہ رہتا اور دل ہی دل میں شیطانی وسوسوں سے بچنے کے لیے دعا "حَسبُنَا اللهُ وَنِعمَ الوَکِیل نِعمَ المَولیٰ وَنِعمَ النَّصِیر" پڑھتا رہتا۔ ایک دن جب شریفاں آئی تو اس نے اپنے مخصوص نوچ دار انداز میں کہا کیوں چودھری اشرف جی کیا حال ہے۔ اشرف خاموش رہا وہ قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور کہا:

"چودھری جی! میں نے عرض کیا، کیا حال ہے۔ وہ کچھ کھسیانی سی ہو کر بولی۔ بہن شریفاں بی
بی اللہ کا کرم ہے۔ یہ دیکھو، جوان عورتوں کا اکیلے مردوں کے پاس بغیر کسی کام کے جانا بڑا
خطرناک ہے۔ یہ کہہ کر اشرف دکان کے اندر چلا گیا اور اس نے دیکھا شریفاں کا رنگ فق ہو
گیا۔ اس کی آنکھوں کے جلتے دیئے بجھ گئے۔ اس کی نگاہِ خاص مر گئی۔ وہ غیر مرئی ہاتھ جو غیر
محسوس انداز میں اس کی آنکھوں کے راستے اتر کر اس کے دل کو مٹھی میں لے لیتے تھے۔
مکڑی کے تاروں کی طرح ٹوٹ کر گر گئے۔ وہ تھوڑی دیر حیران و ششدر کھڑی رہی اور پھر
خاموشی سے واپس چلی گئی۔ ابلیس کا طلسم ٹوٹ گیا تھا اور ساغر و مینا مشاہدہ حق سے ٹکرا کر
چور چور ہو گئے تھے۔"(۱۹)

افسانہ "فریبِ نفس" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عصمت جاوید لکھتے ہیں:

"افسانہ فریبِ نفس میں دنیا اور آخرت کا فرق افسانے کے مرکزی کردار اشرف کی داخلی
کشمکش کے پس منظر میں اتنی خوبی سے بیان ہوا جو عام افسانہ نگار سے ممکن نہیں۔ ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بذات خود "فریبِ نفس" کی صبر آزما منزل سے گزرا اور داخلی
الجھنوں میں مبتلا رہا"(۲۰)

افسانہ "کورٹ شپ" کا لفظ بھائی جان اور افسانہ "فریبِ نفس" کا لفظ "بہن" مینا و ساغر کے جام توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ افسانے سید اسعد گیلانی کے گہرے مشاہدے اور ذہن کی تیزی کو ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ مشاہدے اور ذہن کی صلاحیتوں کے بغیر افسانہ لکھنے کی کوشش لایعنیت کو جنم دیتی ہے۔

افسانہ "مخالف سمتیں" رومانس اور حقیقت کا امتزاج لئے ہوئے ہے۔ اس افسانہ کے کردار ڈکسن اور فنٹائن ہیں ویتنام پہنچ کر انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان کسی فاصلے کی کوئی دیوار حائل نہ ہے۔ افسانے میں رومان کا رنگ کچھ یوں ملتا ہے:

> "یہاں کالے کوسوں دور آکر اچانک ان کا آمنا سامنا ہو گیا اور بہت جلد ایک دوسرے سے متعارف اور مانوس ہو گئے۔ وہ فوجی کلب کی محفلِ رقص میں یوں گھل مل گئے۔ گویا ایک ساتھ کھیلتے کھیلتے جوان ہوئے تھے۔ فوجی زندگی ایک لا اُبالی زندگی کا نام ہے جہاں فوجی ضوابط کی پابندی کے بعد ہر اخلاقی بندش کھل جاتی ہے۔ اور پھر اخلاق تو ایک لفظ ہے جو مارکس کے زمانے سے بھی قبل کی۔۔۔۔۔ ایسے پرانے لفظ کا آج کل کی عملی دنیا سے کیا واسطہ۔" (۲۱)

ڈکسن اور فنٹائن کی رفاقتیں ایک دوسرے کے لیے وقف تھیں مگر جس ہستی سے وہ محبت کا دعویٰ کیے ہوئے تھا وہ سرمایہ داری کے خلاف تھی۔ افسانہ نگار نے فنٹائن کے ذریعے مغربی نظام پر جو طنز کی وہ ملاحظہ ہو:

> "کیا یہ دنیا کی عظیم آبادی پر ایک شدید ظلم نہیں ہے کہ جو بوئے وہی بھوکا رہے اور جو تعمیر کرے وہی فٹ پاتھ پر گرمی اور سردی کا شکار ہو۔ وہ ڈکسن کو باور کراتی رہتی کہ اس انسان کو تصور کرو جو سرمائے کا پھندا لگائے دنیا میں بیٹھا انسانوں کا شکار کر رہا ہے۔ وہ کاروں میں گھومتا، فلک بوس بلڈنگوں میں رہتا اور تیل کے چشموں کے خواب دیکھتا ہے۔" (۲۲)

افسانے میں تجسس اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ تین اطراف سے امریکی فوجی اور ایک طرف طبی امدادی دستے زیرِ زمین کیمپ جہاں فنٹائن اور اس کے ماتحت چار دوسری نرسیں، ڈیوٹی پر پوری طرح مستعد تھی، کمیونسٹوں کا دستہ ان کے سامنے سے گزر گیا کیونکہ فنٹائن کا ہاتھ ان پر گولی چلانے کے لیے تیار نہ تھا اور دیگر نرسوں کو بھی اس نے اس کام سے باز رکھا کیونکہ اسے امریکی نظریہ جنگ سے اختلاف تھا۔ ڈکسن جو اپنے شکار کا پیچھا کر رہا اسے فنٹائن کی اس حرکت پر دکھ ہوا اور غصے میں آکر اسے گولی مار دی۔ گولی اسے کیا لگی وہ ایک بگولہ بن کر ڈکسن کے دماغ میں گھس گئی۔ افسانے کا نقطہ انجام ملاحظہ ہو:

> "محبت غالب آنے پر اس نے فنٹائن کو گود میں اٹھا لیا اور معافی طلب کی تو اس نے کہا معافی کیسی میرے ڈکی! تو نے اس کمیونسٹ لڑکی کا نشانہ بنایا، جسے مارنا تمہارا فرض تھا۔ اپنی محبوبہ کو تم گود میں لیے بیٹھے ہو۔ وہ فنٹی کے خون آلود جسم کو گود میں اٹھائے کیمپ کی طرف جا رہا تھا۔ اتنا بوجھل کہ جیسے اس نے امریکہ سے ویتنام تک کا پیدل سفر کیا ہو۔" (۲۳)

یہ افسانہ محبت اور نظریہ کی کشمکش لیے ہوئے ہے۔ رومانس کے ساتھ اصل کہانی بھی افسانہ نگار کی نشتریت سے نہ بچ سکی وہ ایک ایسے انداز میں طنز کرتا ہے کہ جنگ وہ بھی پرائے دیس میں یہ سرمایہ داری نظام کی ایک فطرت ہے۔ افسانہ میں نظریہ کی جیت ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید اسعد علی گیلانی: "حکایاتِ جنُوں" اُردو ادب اسلامی، سرگودھا، س ن، ص ۱۳

۲۔ سید اسعد علی گیلانی: "ٹوٹی ہوئی اینٹیں" الفیصل ناشران، تاجران کتب، لاہور، س ن، ص ۱۷۰

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔۱۹۲

۶۔ القرآن الکریم: النساء: ۳۶

۷۔ القرآن الکریم: البقرۃ: ۱۷۷

۸۔ سید اسعد علی گیلانی: "ٹوٹی ہوئی اینٹیں" ص ۱۲۳

۹۔ القرآن الکریم: البقرۃ: ۲۱۵

۱۰۔ سید اسعد علی گیلانی: "حکایاتِ جنُوں" ص ۱۵

11۔ https://darulifta-deoband.com/home/ur/hadith-sunnah/43142, Retrieved at :10-12-2021

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۱۳۔ سید اسعد علی گیلانی: "حکایاتِ جنُوں" ص ۷۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۲

۱۵۔ سید اسعد علی گیلانی: "ٹوٹی ہوئی اینٹیں" ص ۷۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۱۸۔ سید اسعد علی گیلانی: ”ٹوٹی ہوئی اینٹیں“ ص ۷۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۲۱۔ سید اسعد علی گیلانی: ”ٹوٹی ہوئی اینٹیں“ ص ۱۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۳۔ ایضاً